مباحثہ ومکالمہ

مکاتیب

(۱)

مشفقی ومکرمی جناب عمار ناصر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی بخیر!

مئی 2014ء کے شمارہ ''الشریعہ'' میں جناب عاصم بخشی کا مکتوب نظر سے گذرا جس میں غزالی اور ابنِ رشد کے حوالہ سے میرے مضمون (فروری، مارچ 2014ء) پر کچھ تعریضات پیش کی گئی ہیں۔ زیرِ نظر مکتوب کے اندر انہی تعریضات کے جواب میں کچھ توضیحات پیش کرنا مقصود ہیں۔

۱۔ مکتوب نگار کو اعتراض ہے کہ غزالی کا دفاع کرتے ہوئے میں نے اپنے مضمون میں ناقدینِ غزالی کے جس ''فرضی حملہ'' کے خلاف جوابی کارروائی کی ہے، اس حملہ کا کوئی حوالہ اور ماخذ نہیں بتایا اور نہ ہی اس حملہ کے کسی ذمہ دار کی نشان دہی کی ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ غزالی پر یہ ''فرضی حملہ'' آج روشن خیالوں کے ہر دوسرے جتھے کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کا اعتراف خود مکتوب نگار نے بھی چند سطروں کے بعد کیا ہے۔ ویسے میرے مضمون کی ابتداء میں ڈاکٹر سلیمان دنیا کی عبارت بھی موجود ہے جو اس بات کی شہادت ہے کہ غزالی پر یہ حملہ عالمی اور غیر علاقائی نوعیت کا ہے اور بعض اوقات اس میں بڑے بڑے دانش ور بھی ملوث ہوتے ہیں۔ اب وہ خود ہی بتائیں کہ اس صورتِ حال میں اس ''حملہ'' کی فی الواقع موجودگی کو ثابت کرنے کے لئے آخر کسی ایک مخصوص مقالہ کا حوالہ دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

۲۔ مکتوب نگار کی رائے میں غزالی پر مختلف الخیال حلقوں کی طرف سے مختلف نوعیت کی تنقیدات کی جاتی ہیں، ان میں سب سے غیر علمی اور سطحی تنقید وہی ہے جو ہمارے نام نہاد مسلم معقولیین اور متجددین کی طرف سے ہوتی ہے اور جس کے خلاف جوابی کارروائی کا بیڑا میں نے اٹھایا ہے۔ مذکورہ تنقیدی حملہ کو سطحی اور غیر علمی قرار دینا بالکل بجا، لیکن اگر اس طرح سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس غیر علمی تنقید کا جواب دینا بھی ایک فضول اور زائد از ضرورت کام ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ مکتوب نگار کی سادہ لوحی ہے۔ گم راہ کن غلط فہمیوں کو اگر صرف سطحی اور غیر علمی کہہ کر چھوڑ دیا جائے تو بعض اوقات وہ اتنی تناور ہو جاتی ہیں کہ ان کے خلاف بولنا بے اثر ہو جاتا ہے۔ غزالی کو پوری عقلی روایت کا مخالف گردانا اور سائنس و مذہب کی ہم آہنگی کے خلاف سمجھنا ایک غلطی ہے اور یہ غلطی آج صرف غزالی کے نقادوں سے ہی

نہیں، بلکہ غزالی کے بعض سادہ لوح مریدوں سے بھی اسی غلطی کا ارتکاب ہوتا ہے اور وہ بزعمِ خود اس ''رویہ'' کو غزالی کی خوبی سمجھتے ہیں۔ یعنی غزالی خود اپنی کتاب ''تہافت'' اور ''المنقذ'' میں جس رویہ کی بار بار مذمت کرتے ہیں کہ ''حکمت وفلسفہ'' کی مطلق تنقید سے اسلام کو کوئی فائدہ پہنچنے والا نہیں، جس رویہ کو وہ ''صدیق للا سلام جاہل'' یعنی اسلام کے نادان دوست کا رویہ کہتے ہیں اور جس کے خلاف غزالی کے بعض مذمتی بیانات ہم اپنے مضمون میں نقل کر چکے ہیں، اسی رویہ کو غزالی کے ''اپنے'' اور مخالف، دونوں ہی غزالی کی طرف منسوب کرتے ہیں، اس کو ''ثابت'' کرنے کے لیے باقاعدہ مورچے لگاتے ہیں اور پھر داد کے منتظر ہوتے ہیں۔ ہمارے مکتوب نگار دوست کا خیال ہے کہ اپنوں اور غیروں کی اس سنگین علمی غلطی کو ابھی بھی صرف سطحی اور غیر علمی کہنے پر اکتفاء کیا جائے۔

۳۔ مسلم ''حکیموں'' اور فلسفیوں میں کچھ تو وہ تھے جنہوں نے خود کو غیر مابعد الطبیعیاتی علوم تک محدود رکھا، جبکہ کچھ نے مابعد الطبیعیات (الٰہیات) میں بھی ٹانگ اڑائی اور یوں دین کے دائرہ میں دخل اندازی کی۔ یہ دخل اندازی کیوں ناروا تھی، اس موضوع پر کچھ گفتگو میں اپنے مضمون میں کر چکا ہوں۔ مکتوب نگار کا نکتہ اعتراض یہ ہے کہ ''مسلم'' حکماء کے مابین یہ خطِ تقسیم غیر حقیقی ہے۔ ''مسلم'' حکماء کا علمی منبع وماخذ یونانی علمیت تھی اور یونانی علمیت ایک اکائی کا نام تھا جس کا ایک لازمی جزو مابعد الطبیعیات بھی تھی۔ یونانی علمیت کا کوئی بھی قاری، متعلم اور ماہر اس کے کسی خاص جزو کو نظر سے گذارے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ بہت مشکل تھا کہ یونانی علمیت کے تمام اجزاء اس کی نظر سے گذریں مگر اسی علمیت کا ایک لازمی جزو ''مابعد الطبیعیات'' اس کی نظر سے اوجھل رہ جائے۔ مکتوب نگار کی یہ ساری گفتگو اغلبا درست ہے اور میں نے ایسی کوئی بات سرے سے نہیں کی جس کے جواب میں وہ یہ سب کہنے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ بعض حکماء کے بارہ میں میرا یہ موقف اور حسنِ ظن کہ ''انہوں نے خود کو غیر الٰہیاتی علوم تک محدود رکھا'' اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ سرے سے یونانی الٰہیات ان کی نظر سے ہی نہیں گذری۔ اس کا م مفہوم اور مدعا فقط یہ تھا کہ انہوں نے اس مابعد الطبیعیات کے لئے تائید وحمایت کی کوئی پوزیشن اختیار نہیں کی اور اس معاملہ میں خود کو یونانی الٰہیات کا دفاعی فریق نہیں بننے دیا۔ یوں بھی دیکھا جائے تو فی نفسہ کفریات کا مطالعہ نہیں، بلکہ ان کی تائید وتصدیق اصل میں قابلِ اعتراض چیز ہے، ورنہ تو وہ بہت سے فلسفی بھی اس کی زد میں آ جائیں گے جو دراصل یونانی الٰہیات کے ناقد ہیں مثلاً خود غزالی اور ابوالبرکات بغدادی وغیرہ، کیونکہ یہ حضرات یونانی الٰہیات کا مطالعہ ہی نہیں، اس پہ عبور رکھتے تھے اور کم از کم ان لوگوں کو تو برے فلسفیوں کی کیٹیگری میں شامل کرنا ہمارا مدعا ہرگز نہیں تھا۔ اگر مضمون کے اندر میرے مدعا کے ابلاغ میں کوئی سقم رہ گیا تھا تو امید ہے کہ اب اس کا ازالہ ہو چکا ہوگا۔ میری پہلی قسط میں صفحہ ۱۶ کی ساری گفتگو کو اگر سیاق وسباق کے ساتھ پڑھ لیا جائے تو وہ ''محدود رکھنے'' کے اسی مفہوم کی متقاضی ہے اور اس میں مذکورہ حکماء کے ساتھ ہمارے حسنِ ظن کے قرائن بھی موجود ہیں جن سے مذکورہ بالا خط تقسیم کی موجودگی بھی ثابت ہوتی ہے۔

مکتوب نگار کی رائے میں، اِس راقم نے خود ہی سائنس اور فلسفہ کو گذشتہ تاریخ کے اعتبار سے مرتکز اور ہم معنی تک کہا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یونانی علمیت بشمول اپنی الٰہیات وغیر الٰہیات کے ''مسلم'' حکماء کے سامنے ایک ''کل''

اور اکائی کی حیثیت سے موجود تھی اور مسلم حکماء کی اس سے مشغولیت بھی ایک اکائی ہی کی حیثیت سے تھی۔ اطلاعاً عرض ہے کہ فلسفہ اور سائنس کے جس ارتکاز اور وحدتِ اطلاق کی بات مکتوب نگار میری طرف منسوب کر کے ''خطِ تقسیم'' کو غیر حقیقی ثابت کرنا چاہتے ہیں، اس حوالہ سے میرے مضمون کا مواد بھی درحقیقت ''خطِ تقسیم'' کی نشان دہی کرتا ہے اور اس بات کا قرینہ ہے کہ ''مسلم'' حکماء وفلاسفہ میں دلچسپی کے دائرے مختلف رہے تھے، وہ بے شک ''جامع العلوم'' رہے ہوں گے مگر ضروری نہیں کہ الٰہیات میں نفیاً یا اثباتاً ان کی دلچسپی بھی یکساں رہی ہو۔ چنانچہ پہلی قسط میں صفحہ ۱۶ کے درمیانی پیراگراف کو دوبارہ پڑھ لیجئے۔

۴۔ بشمول کچھ اور فلاسفہ وحکماء کے، میں نے محمد بن زکریا رازی، البیرونی اور عباس بن فرناس (اس کا نام مسلم بن فرناس لکھنا شاید میری غلطی تھی) وغیرہ کے بارہ میں یہ لکھا تھا کہ ''ہمارے علم کے مطابق'' انہوں نے خود کو غیر مابعد الطبیعیاتی علوم تک محدود رکھا۔ اب ان میں سے کسی کے بارہ میں اگر یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ فی الواقع خالصتاً غیر الٰہیاتی ''حکیم'' نہیں تھا تو اس میں کوئی حرج نہیں، ہمیں بھی ہر ایک کو بہر صورت یہ ثابت کرنے پر اصرار نہیں اور اسی وجہ سے ہی ہم نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں ''ہمارے علم کے مطابق'' کی شرط کا اضافہ مضمون کے متن میں ہی کر دیا تھا۔ ثابت تو صرف یہ کرنا مقصود تھا کہ کچھ حکماء بہر حال ایسے بھی تھے کہ جنہوں نے خود کو غیر الٰہیاتی علوم تک محدود رکھا اور اس کے قرائن بھی موجود ہیں۔ باقی دی گئی مثالوں میں سے اگر کوئی مثال اس صورت کے مطابق نہیں ہے تو اس سے ہمارے اساسی موقف پر بہر حال کوئی زد نہیں پڑتی۔ رازی اور عباس بن فرناس کے بارہ میں مکتوب نگار کی دی گئی معلومات درست ہو سکتی ہیں کہ انہوں نے خود کو غیر الٰہیاتی علوم تک محدود نہیں رکھا، مگر البیرونی کے بارہ میں ان کا یہ کہنا کہ وہ ''ہندویات'' کا ماہر تھا، کیا معنی رکھتا ہے؟ وہ ہندویات کا ماہر تو تھا، لیکن کیا ہندی کفریات کی کوئی تصدیق وتائید یا اس ضمن میں کوئی قابلِ اعتراض بیان بھی اس سے منقول ہے؟ اگر نہیں تو پھر اس کا شمار انہی ''حکماء'' میں ہونا چاہئے جنہوں نے خود کو الٰہیات میں کوئی نئی اور متنازعہ ''ایجاد'' پیش کرنے سے محفوظ رکھا اور جنہیں کبھی بھی مسلم معاشرہ میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مکتوب نگار کو یہاں پر ایک بار پھر ''محدود رکھنے'' کا معنی سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے۔

۵۔ مکتوب نگار کی رائے میں اگر ہم غیر متعصب ہو کر دیکھیں تو دیکھیں گے کہ بوعلی سینا وغیرہ مسلم فلاسفہ افلاطونی روایت کے غضب ناک حملہ کے خلاف مسلسل برسرِ پیکار ہیں جس کی بہر حال تحسین ہونی چاہئے۔ مکتوب نگار کو چاہئے کہ وہ خود ان کی اس جدوجہد پر ذرا تفصیلی کلام کریں اور یہ بھی بتا دیں کہ اگر کسی ملحد میں صدقہ وسخاوت جیسی کچھ اچھی صفات پائی جاتی ہوں تو کیا ان کی وجہ سے اس کے الحاد وبے دینی سے چشم پوشی کر لینی چاہئے؟

۶۔ میں نے لکھا تھا کہ ایک مسلمان کے فلسفیانہ غور وفکر کو شرعی حدود وقواعد کا پابند ہونا چاہئے۔ مکتوب نگار کو اعتراض ہے کہ ''قرآن میں باقاعدہ تلقین کی گئی ہے کہ حق وسچ کو تلاش کرنے لئے انفس وآفاق میں غور کیا جائے، لہذا فلسفیانہ غور وفکر کو نام نہاد شرعی حدود کا پابند بنانے کا کوئی جواز نہیں ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ متجسس دماغ اس کو قبول کر لیں، الا یہ کہ ماضی کے کلیسائی جبر کی تاریخ دہرائی جائے۔'' اطلاعاً عرض ہے کہ فلسفیانہ غور وفکر میں حتمیت وقطعیت کوئی چیز نہیں

ہوتی جس کا اعتراف خود مکتوب نگار بھی کریں گے اور یونانیوں و ''اسلامیوں'' کا علمِ الٰہیات تمام کا تمام ظن وتخمین پر ہی مبنی ہے۔ اس میں ان مسائل کو قطعی عقائد کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جن کی کوئی قطعی دلیل قطعاً موجود نہیں ہے۔ جن چیزوں کا حتمی علم نہ ہو، ان کے بارہ میں فلسفیانہ غور وفکر جاری رکھنا اور پھر بالآخر محض ظن وتخمین کی بنیاد پر کوئی رائے بھی قائم کر لینا کیسا ہے اور قرآنی تعلیم اس کے بارہ میں کیا ہے؟ سنئے: ''ولا تقف مالیس لك به علم، ان السمع والبصر والفواد کل اولئك کان عنه مسئولا'' یعنی ''جن چیزوں کا کوئی حتمی علم تمہیں نہیں ہے ان کے پیچھے مت پڑو اور نہ ان کی پیروری کرو، کیونکہ دید، شنید اور دھڑکتا دل، ان سب کو اپنی اپنی طرف سے جواب دہ ہونا ہے۔'' (الاسراء: ۳۶) یعنی اسی جواب دہی کا احساس کرتے ہوئے مشتبہ امور میں بے مقصد اور بے نتیجہ غور وفکر کر کے اپنی توانائیاں ضائع نہ کرو، خصوصاً جبکہ معاملہ مقدس الٰہیاتی شعائر کا ہو تو غیبی حقائق کے بارہ میں اٹکل پچو لگانا ان مقدس شعائر کی بے حرمتی اور حق تلفی کا سبب بن کر ایمان کے لئے بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔ مشرکینِ مکہ کا ملائکہ کو مؤنث سمجھنا ظن وتخمین پر مبنی اسی فلسفیانہ غور وفکر کا ہی نتیجہ تھا اور اسی پہ اللہ نے فرمایا تھا کہ کیا تم فرشتوں کی تخلیق کے وقت سامنے موجود تھے؟ یونانیوں کی الٰہیات بھی تمام کی تمام ظنی وفرضی چیزوں پر مبنی ہے، معدودے چند باتوں کے علاوہ کسی بھی چیز کی کوئی قطعی وحتمی دلیل موجود نہیں ہے۔ غزالی کی تہافت کا ایک بڑا حصہ محض یہی ثابت کرنے کے لئے ہے جس کی تفصیلی نشان دہی ہم اپنے مضمون میں کر چکے ہیں۔ اسلام کا خدا فلسفیوں کے خدا کی طرح کوئی سائنسی فارمولا ٹائپ کی چیز نہیں ہے جس کا کوئی وقار اور احترام نہ ہو۔ یہاں تو ہر اس چیز کا بھی احترام ہے جو خدا کی طرف سچائی کے ساتھ منسوب ہو جائے۔ اسلامی عقائد اور غیبی تصورات جہاں تک ثابت ہیں، وہ سب کے سب عقلاً بلکہ بداہتہً ثابت ہیں اور کسی بھی انسانی رشتہ سے زیادہ ان کا تقدس اور احترام واجب ہے۔ کیا کوئی بھی معقول انسان اپنے محترم اور عزیز رشتوں کو ظن وتخمین پر مبنی فلسفیانہ غور وفکر کا میدان بنانا پسند کر سکتا ہے؟ اگر نہیں تو قطعیت کے ساتھ ثابت ان اسلامی عقائد کو فلسفیانہ غور وفکر کا شوق پورا کرنے کے لئے تختۂ مشق بنانا اور بنا کسی معقول دلیل کے ان کے بارہ میں رائے قائم کر لینا بھی قابلِ مذمت ہے اور مذکورہ بالا آیت کی رو سے اس پہ سخت جواب دہی کا اندیشہ ہے۔

قرآن میں انفس وآفاق اور کائنات کے اندر جو غور وفکر کرنے کی تلقین کی گئی ہے، اس کے حاصلِ معنی پر ہم اپنے مضمون ''تدبرِ کائنات کے قرآنی فضائل'' (الشریعہ۔ جون 2014ء) میں تفصیلی کلام کر چکے ہیں۔ اس سے نہ تو الٰہیاتی امور میں ہونے والا ظن وتخمین پر مبنی فلسفیانہ غور وفکر مراد ہے اور نہ ہی طبیعیاتی امور کے اندر ہونے والا سائنسی وتجرباتی غور وفکر۔ ہاں، البتہ وہ روحانی اور الٰہیاتی غور وفکر ضرور مراد ہے کہ جس کی طرف خود کائنات بھی پورے زور وشور کے ساتھ انسان کو دعوتِ التفات دے رہی ہے، جس سے انسان میں خالقِ کائنات کی عظمت، قوت، قدرت، بادشاہت، رحمت، حکمت، علمی وسعت اور لامحدود بڑائی کے تصورات راسخ ہوں، جس غور وفکر کے نتائج بالکل قطعی وعام فہم ہیں اور ان میں کوئی فلسفیانہ جھول یا اشتباہ نہیں پایا جاتا جیسے وجودِ باری تعالیٰ، توحید اور خالق کی تقدس آمیز صفات (قدیر، عظیم، علیم، کریم وغیرہ) اور جس غور وفکر کے نتیجہ میں ہی اسلامی الٰہیاتی تصورات کا اتنا تقدس طے پایا ہے کہ ان کے بارہ میں

اٹکل پچو لگانا، بغیر یقین کے لب کشائی کرنا اور فلسفیانہ غور وفکر کا میدان بنانا ان کی بے حرمتی قرار پاتا ہے۔

فلسفیانہ غور وفکر ایک مشغلہ ہے اور یہ مشغلہ کسی حد تک مباح بھی ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اپنی جائز حدود تک محدود رہے۔ الٰہیات کے تقدس کے پیش نظر اس میں ایسی کوئی رائے قابل قبول تو کجا، قابل برداشت بھی نہیں ہے جو ظنی وتخمینی اندازوں پر مبنی ہو، صرف وہی آراء یہاں قابل قبول اور معتبر ہیں جو عقلاً پوری قطعیت کے ساتھ ثابت ہوں یا پھر وحی کے قطعی ذریعہ سے ماخوذ ہوں، باقی جتنے مشتبہ احتمالات ہیں، ان کے بارہ میں کچھ کہنے اور سوچنے سے اپنے آپ کو دور رکھنا ہی عافیت کا راستہ ہے اور کم از کم مقدس الٰہیاتی شعائر کے بارہ میں ایمان کے لئے خطرناک اور خدا کی ناراضگی کا باعث بننے والے ایسے رویہ کا تحمل کوئی مسلمان تو بالکل نہیں کر سکتا۔ مثلاً وقت اور ''زمان'' کے ''قِدم وحدوث'' کی بحث کو لے لیجئے جو مکتوب نگار نے بلاوجہ چھیڑی ہے اور پھر خود اظہار کیا ہے کہ اس بحث کا کوئی تسلی بخش، حتمی اور قطعی فلسفیانہ جواب ممکن نہیں ہے۔ یہ بحث مذکورہ آیت کی رو سے قابلِ مذمت ہے۔ اپنے ایمان کے لئے اتنی سی بات کافی ہے کہ ''اللہ خالق کل شیء'' یعنی ''اللہ ہر چیز کا خالق ہے۔ (الانعام:۱۰۲) اس کی تفصیل میں جا کر ہم ان بہت سی چیزوں کا نام بھی لے سکتے ہیں جو عام فہم ہیں، جن کا تصور کرنے کے لئے کوئی فلسفیانہ پیچ وتاب کھانے کی ضرورت نہیں ہے اور جن کا ذکر خود خدا نے انسان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کیا ہے، مثلاً سورج وچاند، زمین وآسمان، ستارے اور سیارے، پہاڑ ودریا، بادل وبارش، گرمی وسردی، صحت وبیماری، جن وانسان، چرند پرند، شجر وحجر، دن ورات، ہفتے ومہینے اور دوسری بہت سی چیزیں۔ باقی رہیں ''زمان'' جیسی پیچیدہ تصوراتی اور خیالی چیزیں جن کے بارہ میں پہلے دن سے طے ہے کہ ان پر جتنی بھی بحث کر لی جائے وہ بے نتیجہ رہے گی، ان کا کوئی قطعی حل انسانی فہم وادراک کے پاس نہیں ہے (الا یہ کہ تانیثِ ملائکہ کی طرح کا کوئی ''حل'' فرض کر لیا جائے)، بلکہ محض ان جیسی چیزوں کا تصور کرنے کے لئے ہی انسانی عقل کا پہلے مصنوعی وغیر فطری تفکرات کا عادی ہونا ضروری ہے تو جب ایسی چیزوں کا تعلق مقدس دینیاتی امور سے بھی ہو تو ایسی چیزوں کے بارہ میں نہ سوچنا اور ان کے پیچھے نہ پڑنا ہی سلامتی کا راستہ ہے۔ خود ساختہ ''نتیجہ'' اخذ کرنے میں اگر کوئی اونچ نیچ ہو گئی یا بارگاہِ الوہیت کے آداب کی کوئی حق تلفی ہو گئی تو اپنی نجات ہی خطرے میں پڑ جائے گی، کسی دوسرے کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ جبکہ دماغی بوکاٹوں کے وقتی تلذذ کے لئے اپنی ابدی نجات کو خطرے میں ڈالنا سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ بہ الفاظِ اقبال:

خرد ہوئی ہے زمان ومکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں، لا الہ الا اللہ

رہا معاملہ متجسس دماغوں کا اور ماضی کے کلیسائی جبر کا تو گذارش یہ ہے کہ شرعی نقطہ نظر متجسس دماغوں کی پسندیدگی کو دیکھ کر طے نہیں کیا جاتا، البتہ سائنسی تدبر کے خلاف کلیسا کے جبر کو ہم بھی قابلِ مذمت سمجھتے ہیں، لیکن مابعد الطبیعیاتی شعائر کے بارہ میں فلسفیانہ تخمینہ بازی پر عائد کی گئیں مدلل اور بامقصد شرعی قدغنوں کو ماضی کے کلیسائی جبر کے ساتھ جوڑنا ناقابلِ فہم اور افسوس ناک ہے۔ ہمارے مسلم اہلِ علم مثلاً غزالی وغیرہ تقریباً ایک ہزال سال پہلے ہی یہ وضاحتیں

کر چکے ہیں کہ (جس طرح کی چیزوں میں کلیسا نے جبر کا مظاہرہ کیا تھا) ایسی چیزوں میں فلسفیوں کے ساتھ مناظرہ کرنا ہی نامعقول اور خود دین کے مقدمہ کو کم زور کرنے کے مترادف ہے۔ میری دوسری قسط کے آخری پیرا گراف کو ذرا توجہ سے پڑھ لیجئے۔

۷۔ مکتوب نگار نے سائنس کی تعریف کا سوال بھی اٹھایا ہے تو ہمارے نزدیک سائنس نام ہے مادی کائنات پر غیر روحانی وغیر الہیاتی تدبر کرنے اور اس سے نتائج اخذ کرنے کا۔ اب اگر مابعد الطبیعیاتی سوالات سائنس کا جزو سمجھے جاتے ہیں تو ٹھیک ہے، ہمیں اس پہ کوئی اعتراض نہیں، مگر جو اعتراض پہلے فلسفہ پر ہوتا تھا، اب وہی سائنس پر ہوگا کیونکہ اصل اعتراض اس سرگرمی پر ہے جو الہیاتی تقدسات کے خلاف ہے، خواہ وہ فلسفہ کہلائے یا سائنس۔ الہیات میں صرف قطعی اور حتمی بات قابلِ قبول ہے، اگر فلسفہ یا سائنس کوئی قطعی اور نیا ''انکشاف'' کرتے ہیں جو واقعتاً قطعی ہو اور نیا بھی تو اسلام کو اس پہ کیا اعتراض ہو سکتا ہے، مگر عملاً کوئی انکشاف ایسا ہوگا نہیں۔ فلسفہ کہیں، سائنس کہیں، دماغی کاوش کہیں، عقلی روایت کہیں یا کچھ اور، اسلام کے ساتھ ان کی ہم آہنگی کی یہی ایک صورت ہے کہ یہ قطعیت کے ساتھ ثابت اسلامی شعائر کا احترام ملحوظ رکھیں اور ان پہ غیر یقینی مشتبہات کی نشانہ بازی سے باز رہیں، یہی ہم آہنگی منصفانہ ہے، مطلوب بھی اور اس کے اثبات ہم نے غزالی کے حق میں کیا تھا۔

۸۔ مکتوب نگار نے غزالی اور ابنِ رشد کے جن چند ضمنی اختلافات کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ غزالی کا اصل مقدمہ جیسا کہ ہم مضمون میں عرض کر چکے ہیں، فارابی، بوعلی سینا اور ان کے پیروکاروں کے خلاف تھا۔ اس کے مقابلہ میں ابنِ رشد کا جواب اب اسی صورت میں جواب کہلانے کا مستحق ہوتا کہ وہ فارابی اور بوعلی سینا کی طرف سے کوئی تسلی بخش قسم کی صفائی دیتے، لیکن ہم عرض کر چکے ہیں کہ وہ اس حوالہ سے بالکل ناکام رہے ہیں۔ پس چند ضمنی اور لفظی اختلافات کو نمایاں کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟

میرا اندازہ ہے کہ مکتوب نگار نے میرے مضمون سے متعلق جو قابلِ ذکر اور دریافت طلب نکات اٹھائے تھے، ان کی مناسب وضاحت ہو چکی ہے۔

والسلام

محمد عبداللہ شارق

mabdullah_87@hotmail.com

(۲)

برادرم جناب محمد مشتاق احمد صاحب

اسسٹنٹ پروفیسر قانون بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ